"میں جی؟... میں تو یہاں سیر کر رہا ہوں... ورنیکلر فائنل کا امتحان دینا ہے ناں میں نے.."

"یہ سیر ہے..." وہ ذرا سید ھے ہو گئے۔

"ہاں جی... پر آپ ماسٹر صاحب کو یہ نہ بتایئے گا کہ میں یہاں آ کر سوجاتا ہوں۔"

"ماسٹر صاحب سے کوئی بول بولے ہوئے مجھے تو مدتیں ہو گئی ہیں شہر یے... میں نے کیا بتانا ہے۔"

"پر وہ آپ کے بیٹے ہیں.. آپ کیوں نہیں بولتے.. میرے ابا جان تو چپ ہی نہیں ہوتے۔"

"ادھر آؤ.."

خاور اپنے گھاس کے مسکن سے اٹھا اور ان کے گدھے کے دوسری جانب جا کھڑا ہوا۔ ابھی نیم تاریکی تھی۔ ابھی نہر کے پانی کا ایک پیوند سورج کی کرنوں کی لشک سے بہاؤ سے جدا نہیں ہوا تھا..

"بیٹا ہونے سے کیا ہوتا ہے.. کچھ بھی نہیں۔ میرے اور بھی بیٹے تھے جو چلے گئے اور مجھے ان کی قبریں بھی یاد نہیں... اسے شوق تھا پڑھائی کا... یہ شہر چلا گیا اور وہاں ماسٹر ہو گیا.. اب گرمیوں کی چھٹیوں میں ادھر آ جاتا ہے تو مجھے تو اس کی شکل بھی بھول چکی ہوتی ہے.. بیٹا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"آپ کبھی شہر نہیں گئے؟" وہ پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ آپ نے کبھی سوڈا واٹر نہیں پیا.. آئس کریم نہیں کھائی... "نیاگرا" فلم نہیں دیکھی.. مارلن منرو کو نہیں دیکھا۔

"نہیں.. میں تو کبھی مگھووال بھی نہیں گیا.."

"کیوں؟"

"کیوں جاؤں؟"

اس کا جواب اسے سُوجھا نہیں.. اور وہ گدھے کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا.. اس کے بال ابھی تک گیلے تھے..

اس روز اُسے معلوم ہوا کہ رسول پور سے آٹھ کوس کے فاصلے پر کسی کلر زدہ رقبے میں کوئی ویرانہ ہے جہاں ایک کچے ڈھارے میں پو اُجی کا پیر اللہ لوک رہتا ہے۔ اسی لیے

وہ ہر جمعے کے روز اپنے گدھے کو نہلاتے سنوارتے تھے۔ پھر آنکھوں میں سُرمے کی سلائیاں پھیر کر عطر پھلیل کی خوشبو لگا کر دھلا ہوا تہبند باندھ کر اس پر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ وہ جمعہ کی نماز اپنے پیر کی امامت میں پڑھتے تھے اور پھر خطبے میں اس کی بشارتیں سنتے تھے اور رات کو واپس آتے تھے.. اور آج جمعہ تھا..

بس اس سویر کے بعد پوا جی فرینڈلی ہو گئے..

وہ اب ہر جمعے کو شام ڈھلے بڑے جوہڑ کے کنارے کیکر کے ٹُنڈ کے اوپر چڑھ جاتا .. اتنا اوپر کہ اگر وہ چتکبرا ٹوبی ادھر آنکلے تو اس کی تھوتھنی اس تک نہ پہنچ پائے.. اور یوں بھی آس پاس بیٹھنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی.. اور پھر پوا جی کی واپسی کا انتظار کرنے لگتا۔

چاچا ماسٹر نے اس دوستی کو پسند نہ کیا..

"بچے... "ایک روز حساب کا کوئی سوال غلط حل کرنے پر انہوں نے اس کے کان کو نامناسب حد تک کھینچا "سوال غلط ہے.. میں نے شاہ صاحب سے وعدہ کر رکھا ہے کہ تو ورنیکلر فائنل میں اچھے نمبر حاصل کرے گا.. اور تو دھیان نہیں کرتا.. پوا جی کے ساتھ وقت ضائع کرتا رہتا ہے.. اس بابے کا دماغ کام نہیں کرتا.. بڑھاپے سے الٹ گیا ہے.."

"پر چاچا جی وہ تو آپ کے ابا جی ہیں.. "اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا..

"ابا جی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بچے.. وہ ایک خود غرض بابا ہے.. اس کے ساتھ وقت نہ ضائع کیا کر.. "یہ منطق اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھی کیونکہ اس کے لیے تو ابا جی ہونے سے ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے اس نامراد گاؤں میں بھیج دیا تھا..

اگلے روز.. اس رات سے اگلے روز جب پوا جی نے اسے بتایا تھا کہ ان کے اللہ لوک کو بشارت ہوئی ہے کہ ایک اور طوفان نوح آنے کو ہے اور اگلے جمعے پوری دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا.. پوا جی اس سے دُور دُور رہے..

عام طور پر سارا دن کھیتوں میں گوڈی کرنے اور کھال مرمت کرنے کے بعد وہ ڈیرے پر واپس آکر الانی چارپائی پر لیٹ جاتے اور اگر چاچا ماسٹر کہیں گئے ہوتے تو اس سے باتیں کرتے رہتے لیکن اس روز وہ واپس تو آئے لیکن اپنی چارپائی سر پر اُٹھا کر کچھ کہے بغیر کماد کے کھیتوں کی طرف چلے گئے..

شام کو گھر آئے تو ان کی سیاہ پوش اولین بہو نے ان کے آگے تندور کی موٹی

روٹیاں اور دودھ کا کٹورا رکھا لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر خاموشی سے کوٹھے پر جا کر سو گئے۔۔

پو اجی پورا ہفتہ اُس سے دُور دُور رہے۔۔

وہ سلام کرتا تو وہ جواب بھی نہ دیتے۔۔

شاید چاچا ماسٹر درست کہتے تھے کہ ان کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔۔ ان کی بے اعتنائی سے اسے بہت دکھ ہوا۔۔ اور وہ بھی ان سے کترانے لگا' روٹھ سا گیا۔۔

جمعہ کی سویر تھی۔۔۔

خاور گھاس اور ترنیل کی ٹھنڈک میں نہر کے پانیوں کے پہلو میں نیم تاریک سویر میں اونگھتا تھا جب اسے "اول حمد خداوی کریئے۔۔" کے بول سنائی دیئے۔

وہ کہنیوں سے ٹیک لگا کر ذرا اوپر ہوا' پو اجی اپنے گدھے کو نہلا رہے تھے۔

وہ ان سے ناراض تھا۔۔ کہنیوں کو ڈھا کر پھر لیٹ گیا۔ ان کی نظروں سے روپوش ہو گیا۔

"اوئے شہریئے۔۔ ناراض ہے؟"

"نہیں جی۔۔" وہ فوراً خوش ہو گیا کہ پو اجی راضی ہو گئے ہیں۔۔

"میرے ساتھ چلے گا؟"

"کہاں پو اجی۔۔" وہ اپنے گوشے میں سے باہر آ گیا۔۔

"اللہ لوک کے ڈیرے پر۔۔"

"چاچا ماسٹر سے پوچھوں گا۔۔ وہ اجازت دیں گے تو۔۔"

"چپ۔۔" انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر غصے سے کہا "کسی سے کچھ نہیں کہنا۔۔ تمہارا ماسٹر تو سمجھتا ہے کہ میرے دماغ میں فتور ہے۔۔ چپ چپیتے چلنا ہے تو چل۔۔۔"

"نہیں پو اجی۔۔"

"اوئے چل شہریئے چل۔۔" پو اجی نے بے حد لجاجت سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔۔ ان کے ریشمی جُبّے پر اس کا منہ تھا اور وہ اس میں سے ایک عجیب مہک سونگھتا تھا "سُن اور غور سے سن۔۔ آج جمعہ کا دن ہے۔۔ یہ آخری دن ہے اس دنیا کا۔۔ یہ بشارت ہوئی ہے میرے اللہ لوک کو۔۔ آج جمعے کی نماز کے بعد ایک اور طوفان نوح آئے گا اور کُل جہان اس میں ڈوب جائے گا۔۔ کوئی زندہ نہیں بچے گا۔۔ شہریئے تو میرے ساتھ چل میرے اللہ لوک کے ڈیرے پر۔۔ تو بھی بچ جائے گا اللہ کے فضل سے۔۔"

پو اُجی اُسے پہلے بتا تو چکے تھے کہ ایسا ہونے والا ہے لیکن اس نے یقین نہیں کیا تھا..
چاچا ماسٹر اپنے اباجی کو بہتر ہی جانتے ہوں گے اور شاید وہ تھوڑے بہت عمر کی وجہ سے شیدائی ہو گئے ہوں تو اس نے یقین نہیں کیا تھا لیکن اب معاملہ سنجیدہ لگتا تھا.. اس گاؤں کی ویرانی اور نامرادی نے اسے پہلے سے ہی ہول میں مبتلا کر رکھا تھا اب یہ حتمی خبر سن کر اس کے بدن میں ایک عجیب سنسناہٹ سی رینگی جیسے بڑے بڑے سیاہ چیونٹے اسے چمٹ گئے ہوں اور کاٹنے کو ہوں۔

"کیسے بچ جاؤں گا پو اُجی؟"

"صرف وہ لوگ بچ جائیں گے جو اللہ لوک کو مانتے ہیں اور میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

روشنی کی پہلی کرنوں نے اپنے حصّے کا مخصوص پیوند نہر کے پانی سے الگ کیا اور وہ لشکنے لگا..

"پر کیسے بچ جائیں گے پو اُجی.."

"حضرت نوح علیہ السلام نے تو کشتی بنائی تھی ناں کیونکہ سیلاب نے آخر کار اتر جانا تھا.. جمعے والے سیلاب نے اترنا نہیں اس لیے میرے اللہ لوک کے ترکھان مریدوں نے لکڑی کا ایک ہوائی جہاز بنایا ہے.. آج جمعہ کی نماز کے بعد ہم سب اس میں بیٹھ جائیں گے .. پھر طوفان آئے گا... سب کچھ غرق ہو جائے گا لیکن وہ جہاز جس میں ہم سوار ہوں گے پہلے پانیوں پر تیرے گا پھر اڑ جائے گا.. اور صرف ہم بچ جائیں گے کُل خدائی میں سے.."

"وہ جہاز کہاں جائے گا پو اُجی.."

"یہ مجھے نہیں پتہ.. پر یہ پتہ ہے کہ اس روئے زمین پر صرف ہم ہوں گے جو زندہ بچ جائیں گے.. باقی سب ڈوب جائیں گے.. تو میرے ساتھ چل شہریئے.."

"ماسٹر صاحب.."

"تو پھر نہ جا.." وہ جلال میں آ گئے' آنکھیں سرخ ہو گئیں "ڈوب جا طوفانِ نوح میں۔ اپنے ماسٹر سمیت.. نہ جا۔"

وہ منہ پھیر کر گدھے کو کنگھی کرنے لگے.. اس سے روٹھ گئے..

اس روز بھی انہوں نے اپنی آنکھوں میں خوب سلائیاں بھر بھر کر سُرمہ ڈالا.. عطر چنبیلی کی پوری شیشی انڈیلی' نیا تہبند باندھا اور گدھے پر سوار ہو کر جانے سے پہلے صرف

اسے ناراض نظروں سے دیکھا اور پھر "چل وچھیرے" کہہ کر بڑے جوہڑ اور سانسیوں کی ٹھٹھی سے پار ہو کر کھیتوں میں او جھل ہو گئے..

ڈیرے پر.. الانی چارپائی پر.. گوٹھ مارے.. خاور حساب کے سوال حل کرنے کی کوشش میں جُتا رہا.. لیکن ہندسے سمجھ میں نہیں آتے تھے آگے پیچھے ہو جاتے تھے جیسے تنکے ہوں اور ان کے پاس پانی آگیا ہو اور وہ تیرنے لگے ہوں.. اس کا اندر بے چینی اور تشویش میں ڈوبا ہوا تھا.. اسے اس خیال نے بھی پریشان کیا کہ شہر میں اس کے ابا جان بھی ڈوب جائیں گے.. میں ان کو اطلاع کیسے کروں.. ڈاک کا لفافہ بھی نہیں ہے اور خط دیر سے پہنچے گا تب پہنچے گا جب وہ ڈوب چکے ہوں گے..

وہ ہول جو رسول پور کی ویرانی اس میں بھرتی تھی، دوپہر کے بعد.. جمعے کی نماز کے بعد.. دوچند ہوا.. ناقابل برداشت ہونے لگا.. وہ چارے اور گنے کے کھیتوں کو ایک سحر زدہ حالت میں تکتا رہا.. ذرا کوئی آواز آتی تو اسے اس میں پانی کی شُوکر سنائی دیتی تھی۔ اسے پکّا یقین ہو چلا تھا کہ بس اب وہ وقت ہے جب گنے کی گھنی فصل میں سے پانی کا ایک ریلا نمودار ہو گا.. وہ اتنا بلند ہو گا کہ شیشم کے یہ پانچ درخت اس میں ڈوب جائیں گے.. جس چارپائی پر وہ بیٹھا ہے وہ پانی کے دوش پر اٹھتی ہوئی درختوں کے آخری پتوں کی بلندی پر پہنچ جائے گی اور پھر اس کے سمیت وہ ڈوب جائے گا.. اور ڈوبنے سے پہلے اسے آخری خیال یہ آئے گا کہ کیا پو اُجی نے جہاز میں اپنے گدھے کو بھی بٹھایا ہے یا اسے پیچھے چھوڑ گئے ہیں..

لیکن کچھ بھی نہ ہوا.. سوائے اس کے کہ چتکبرا بُولی بہت دیر تک بھونکتا رہا..

شام ڈھلی تو وہ جوہڑ کے کنارے کیکر کے ٹُنڈ پر جا بیٹھا.. رات ہو گئی.. رات بہت ہو گئی..

پھر سانسیوں کی ٹھٹھی کے کتے بھونکے.. خاور نے انہیں الگ الگ سنا.. لیکن اس میں چتکبرے بولی کے بھونکنے کی آواز شامل نہ تھی..

گھپ اندھیرے میں ٹرّاتے مینڈکوں اور غل مچاتے جھینگروں میں.. وہ کان لگائے بیٹھا رہا کہ ابھی "اول حمد الٰہی کریئے.. سنائی دے گی.. کچھ بھی سنائی نہ دیا..

چند لمحوں بعد اسے گدھے کے کان دکھائی دیئے..

پھر پو اُجی..

لیکن وہ سر جھکائے چپ بیٹھے گدھے کی حرکت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہلتے چلے آ

رہے تھے.. آج وہ حضرت عیسیٰ کے روپ میں نظر نہیں آرہے تھے..

"پوا جی.." وہ کود کر نیچے آیا.. لیکن انہوں نے گدھے کا رو کا نہیں' روک کر اسے اپنی گود میں نہیں بٹھایا.. اس کی جانب نگاہ بھی نہیں کی.. اسی طرح آہستہ آہستہ گدھے کی حرکت کے ساتھ ہلتے ہلتے اندھیرے میں چلے گئے..

تین روز بعد پوا جی مر گئے۔

ان کی قبر پر جب مٹی ڈالی جارہی تھی تو اس میں بڑے بڑے مکوڑے سیاہ مرچوں کی طرح ملے ہوئے تھے.. کدال پر جتنی مٹی ہوتی تھی اتنے ہی مکوڑے اس میں کلبلاتے تھے.. قبر تیار ہو گئی تو وہ مٹی میں جذب ہوتے گئے.. پوا جی کا بدن تو بہت لشکیلا اور ملائم ہے اسے یہ کیسے کائیں گے.. دو ماہ بعد جب اس کی ورنیکلر فائنل کی قید ختم ہوئی.. گرمیوں کی چھٹیوں کا اختتام ہونے کو آیا تو چاچا ماسٹر نے ایک مقامی کمہار کے سر پر اس کا سیاہ سوٹ کیس رکھ دیا جس کی تہہ میں بچھا اخبار بھورا ہو چکا تھا اور اس میں بسکٹوں کا ایک خالی ٹن تھا اور اسے ہدایت کی کہ چھوٹے شاہ صاحب کو مکھووال جا کر بس پر بٹھادے۔ اگرچہ یہ بھی ایک ویران اور نادار دوپہر تھی لیکن وہ اپنے شہر... اپنے گھر جانے کے چاؤ میں کمہار کے پیچھے پیچھے ایک ٹڈے کی طرح پھدکتا چلا جارہا تھا۔

آٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پگڈنڈی کے دائیں طرف وسیع کلر زدہ ویرانے میں ایک کچی محراب کے آثار دکھائی دیئے جس کے برابر میں مٹی اور گارے سے بنی ہوئی دو کوٹھڑیوں کی چند دیواریں تھی.. چھتیں بھادوں کی بارشوں سے ڈھے چکی تھیں اور ان سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر کلر سے سفید ہوتی.. پپڑیوں سے بھری پیاسی زمین پر ایک عجیب بے ہنگم سی شے کھڑی تھی.. شیشم کے تنے کو کھود کر ایک کھرلی سی بنا کر اس کے آگے دو تختے یوں ٹھونکے گئے تھے کہ وہ ایک صلیب کی صورت نظر آتے تھے..

سوٹ کیس بردار کمہار رک گیا "شاہ جی خیر سے یہی وہ جہاز ہے جس میں سوار ہو کر اللہ لوک کے مریدوں نے اڑ جانا تھا.. جمعہ کی نماز کے بعد اس میں بیٹھ گئے کہ ابھی آیا سیلاب اور شام تک مغرب کی نماز تک بیٹھے رہے پگڑیاں گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر.. پاگل کے بچے.. بھلا لکڑی کا جہاز بھی اڑ سکتا ہے.."

لکڑی کا جہاز اڑ رہا تھا سندھ کے پانیوں پر جو آسمان تھا جسے ابھی ابھی ایک سرخاب

نے خالی کیا تھا لکڑی کا ایک جہاز اڑ رہا تھا..

اور پو اُجی اُس میں اپنے مکھن ملائم بدن کے ساتھ گھٹنے جوڑے انہیں اپنی سفید پگڑی سے باندھے بیٹھے تھے۔ ان کی سفید لٹیں اس آہستگی کے ساتھ جس آہستگی کے ساتھ جہاز جا رہا تھا ہوا میں اٹھتی تھیں اور جب ان پر ڈھلتے سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو نیلے آسمان کے پانیوں میں جیسے ایک چمکیلا پیوند نمودار ہو جاتا تھا۔

لکڑی کا جہاز سندھ کے ریتلے ناپو کے اوپر سے گذرتا تھا.. اور پو اُجی جیسے سنگ مرمر کا ایک مجسمہ ہوں.. حنوط ہو گئے ہوں۔ ایسے بے حس و حرکت.. سکوت میں بیٹھے تھے اور نیچے نہ دیکھتے تھے.. نیچے اُن کا شہر یا بھی لکڑی کے ایک جہاز میں سوار تھا.. عمر' محبت اور بے گھری کے طوفانِ نوح سے بچنے کے لئے.. اس کے ماضی میں جتنے بھی چتکبرے بُولی تھے اُن سے پیچھا چھڑا کر وُہ اس جہاز میں آ بیٹھا تھا..

لیکن پو اُجی تو نیچے دیکھتے نہ تھے..

چائے کا آخری گھونٹ ٹھنڈا یخ تھا..

سرور آنکھیں ملتا.. اوپر سورج کے ڈھلنے کا اندازہ لگاتا کشتی سے باہر آ گیا..

"سائیں رات کرنے کے لئے ڈیرہ ادھر ڈالیں گے یا تھوڑا آگے چلیں.."

"آگے چلیں.." خاور نے تادیر بیٹھے رہنے سے ریت میں دھنسے وجود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا "ادھر تو اوپر سے جہاز گذرتے ہیں سرور.. آگے چلیں"

"جہاز سائیں؟"

"ہاں.." اس نے سر اٹھا کر پھر اوپر دیکھا.. لکڑی کا جہاز اب بھی خالی آسمان میں سُستی سے اڑتا تھا اور پو اُجی کے لمبے بال نیلاہٹ کے پس منظر میں سفید لہروں کی مانند آہستگی سے حرکت کرتے تھے "اوپر دیکھو.."

سرور نے آنکھوں کے سامنے ہتھیلی جما کر اوپر دیکھا نظروں سے آسمان کھنگالا "اوپر تو سائیں ایک دریائی عقاب اڑتا ہے جس کی چونچ میں ایک بہت بھاری مچھلی ہے.. جہاز نہیں.. جہاز بھلا چونچ میں مچھلی دبوچ کر اڑتا ہے.. دھوپ میں پوری دوپہر بیٹھے رہے ہو تو اس کا کچھ اثر ہو گیا ہے سائیں.. آگے چلتے ہیں.."

شام ہونے لگی..

ایک اور شام ہونے لگی..

اس کے سلیپنگ بیگ میں ایک عجیب ناگوار سی گیلی مہک تھی.. پکھی اس پر لیٹی رہی تھی.. دو پاؤں جو جعفر کے تھے کشتی کے چوڑے کنارے پر دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

کشتی بے آواز تیرتی تھی..

سلیپنگ بیگ پر لیٹا خاور ابھی تک پو اُجی کے لکڑی کے جہاز کو دیکھتا تھا.. وہ تنہا بیٹھے تھے ان کے ہمراہ نہ اللہ لوک تھا اور نہ کوئی مرید.. وہ بالکل اکیلے تھے.. اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے گدھے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے.. اگر اس روز وہ ان کا کہا مان لیتا ان کے ساتھ چلا جاتا تو وہ بھی آج ان کے ساتھ بیٹھا ہوتا.. اسے ایک اپنا جہاز بنانے کی حاجت پیش نہ آتی.. وہ نیچے نہیں دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو وہ انہیں ہاتھ ہلا کر کہتا.. پو اُجی میں یہاں ہوں.. انہیں خبردار کرتا کہ سیاہ موٹے مکوڑے مٹی میں جذب ہو کر ان کے ریشمی بدن کو کھانے کے لئے آنے والے ہیں.. لیکن وہ نیچے نہیں دیکھتے تھے.. وہ اپنے گدھے کے پیچھے چھوڑ آئے تھے.. خاور مسکرانے لگا..

باہر کشتی کے کنارے پر جعفر کے دو پاؤں دوڑتے نظر آتے تھے.. یقیناً ان کے اوپر ماماں جعفر کا سیاہ دھڑ بھی تھا.. آسانی سے گنی جا سکنے والی مہین پسلیاں بھی تھیں.. چمکتی بُوٹی بھری آنکھیں اور وہ لنگی بھی تھی جو اس کے درمیانی وجود کو چھپاتی نہ تھی کہ وہ ایک قدیم منہ زور جنور کا بدن تھا جو چھپ نہیں سکتا تھا.. اور اسے چھپانے کی سعی کرتی ایک لنگی بے سود ٹھہرتی تھی..

جعفر کی انگلیاں سندھ کے سینے میں اترتے بانس پر سیاہ کیکڑوں کی طرح پیوست تھیں اس سے چمٹی ہوئی تھیں جونکوں کی مانند.. بانس دریا کی تہہ میں ٹھوکر کھا کر مضبوط ہو کر سیدھا ہوتا تھا اور جعفر کے جنور بجنے کے زور سے کشتی آگے آگے جاتی چلی جاتی تھی۔

ایک اور شام تھی..

بارہ کہو کی پہاڑیوں پر بھی ایک اور اترتی شام تھی..

بڑے پتھر کی کھوہ میں اس کے لئے چکن سینڈوچ اور مشروب تھے اور غلافی آنکھیں اس شام کو اپنے اندر جذب کر کے سپال ہوتی تھیں..

کھڑکی کی چوکھٹ پر انکا سورج ساتوں آئینوں میں اترتی شام کی خبر کرتا تھا۔

بہت سی شامیں گذر چکی تھیں لیکن یہ ایک اور شام تھی..

وہ نہر کنارے گھاس اور ترپل کی ٹھنڈک میں اونگھ گیا تھا اور سویر کی بجائے شام آ گئی تھی..

اس نے کہنیاں ٹکا کر اپنے آپ کو اونچا کیا جیسے "اول حمد خداوی کریے.." کہیں سے سنائی دیا ہو اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا.. جعفر کے پاؤں مسلسل کناروں پر حرکت کرتے تھے اور ان سے پرے سندھ ایک سرمئی سپاٹ صحرا کی مانند خاموشی میں تھا.. تھما ہوا اور سانس روکے ہوئے تھا..

اس نے چوبی پلیٹ فارم پر تب ہاتھ رکھا جب جعفر کے پاؤں اس پر سے گذر گئے.. جب واپس آئے تو اس کے ہاتھ کو راستے میں پڑا دیکھا تو وہ رک گیا "باہر آؤ گے سائیں؟"

"ہاں.."

"تو آؤ.." جعفر کا ہاتھ نیچے آیا.. جسے تھام کر اس نے پلیٹ فارم پر ایک پاؤں جمایا اور پھر زور لگا کر باہر عرشے پر آ گیا.. باہر منظر ہی الگ تھے.. ٹھہرے ہوئے سحر سے پھونکے ہوئے.. وہ کشتی کی نوک سے ذرا ادھر جہاں جعفر کا جال پڑا تھا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر مسافت کی ہوا پھیلنے لگی..

ہر شے ہر وجود ایک خلائی سکون میں خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ چپ اور

گنگ.. جیسے وہ کسی ایسے سیارے میں اتر رہے ہوں جہاں ہوا کا ایک سانس بھی نہیں تھا۔ جنگل بیلے .. دور کنارے.. سروٹ اور بلند گھاس.. پانیوں کی کل دنیا سب ایک سرمئی آہستگی کے سفر میں ایک ہو رہے تھے..

وہ بھول چکے تھے کہ رات کے پڑاؤ کے لیے کسی مناسب ٹاپو یا جزیرے کو ابھی تلاش کرنا ہے اور اس بے آواز خلا میں دم روکے بہتے جا رہے تھے.. کشتی جس منظر کو خالی کر کے آگے بڑھتی تھی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے وہ بھی اُس سرمئی سناٹے میں گم ہو رہا تھا۔ لیکن شام جو اترتی تھی اس میں دائیں جانب 'سندھ کے پھیلاؤ اور ریتلے کناروں کی وسعت کے پار.. بہت طویل فاصلوں پر.. شاید سینکڑوں کوس کے فاصلے پر جو منظر تھا وہ اس سرمئی سناٹے سے بالکل جدا تھا.. وہاں بہت دور ایک سپاٹ افق تھا جہاں سورج مدھم ہو کر بجھتا ہوا نیچے جا رہا تھا.. اور ایک وسیع پھیلاؤ والے تنہا بادل کے سیاہ جال کے اندر اترتا نظر آ رہا تھا.. اس کے زوال کی مدھم روشنیاں پھیل کر جال میں سے فرار ہو کر باہر نکلتے ہی دم توڑتی تھیں.. کوئی ایک لمحہ آیا جب غروب کے اس پس منظر میں سے کوہ سلمان کے دور افتادہ سیاہ کوہان نما پہاڑ اور بلندیاں جیسے غیب سے ظاہر ہونے لگے.. فنا سے وجود میں آنے لگے.. دکھائی دینے لگے.. ابھی وہ مقام خالی اور تاریک تھا لیکن غروب کی کرنوں کا کوئی بھولا بھٹکا زاویہ ان پر ایسے وارد ہوا کہ کوہ سلمان سمندر میں سے یکدم ابھرنے والے بے نام جزیروں کی طرح افق پر جگہ جگہ ظاہر ہونے لگا.. صرف ایک وسیع بادل تھا جس نے ڈوبتے سورج کو اپنے جال میں روپوش کر رکھا تھا اور اس بادل کے کونوں کھدروں میں سے فرار ہونے والی ہلکی زرد.. پگھلتے سونے کی رنگت ایسی روشنی اس پہاڑی سلسلے کے سیاہ کوہانوں کو افق پر نمایاں کر رہی تھی..

یہ کوئی ایسا بالی جزیرہ دکھائی دے رہا تھا جو بحرالکاہل میں قرنوں سے..... بھوکے پیاسے نڈھال آوارہ گرد ملاح کو یکدم سمندر پر معلق گہری دھند میں سے جھلک دکھلاتا ہے اور وہ "بالی ہائے.. بالی ہائے" پکار اٹھتا ہے..

یہ کسی لاکھوں برس پیشتر کے گم شدہ عہد کی تصویر تھی..

ابھی انسان نے اس زمین کو آلودہ نہیں کیا تھا اور منظر بے جھجک تھے..

یہ کسی کوہِ طور کا سلسلہ تھا جو ایک معجزے کی طرح عارضی طور پر یکدم وجود میں آ گیا تھا.. جھاڑی کے اندر سے نور کی جن شعاعوں نے موسیٰ سے کلام کیا تھا بس وہی اس سیاہ

بادل میں سے چھوٹتی تھیں..

اس سحر افروز منظر کا اظہار حیرت کے سوا بھی ہونا چاہیے.. حیرت کے سوا اظہار کا واحد ذریعہ حواس کو تیاگ دینا ہے.. ایسے کہ انسان اس انہونے طلسم کو دیکھ کر پانی میں چھلانگ لگا دے.. اور ڈوب جائے.. نہ ڈوبے تو ابھر کر ایک ڈولفن کی طرح سیٹیاں بجانے لگے اور یوں اپنی مسرت کا اظہار کرے.. یا بہاؤ میں تیرتی کسی مچھلی کی دُم پکڑ کر کوئی فلمی گیت گانے لگے.. یا پھر اتنا تو کرے کہ جعفر یا سرور کو دبوچ کر انہیں چومنے لگے.. حیرت کے سوا کچھ اور کرے.. اور چونکہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے ذہنی طور پر پسماندہ ایک بچے کی مانند منہ کھولے 'ہونٹ ڈھیلے چھوڑے' ایسے کہ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے لعاب بہہ کر اس کے رخساروں پر اترتا ہوا اور وہ بے خبر رہے.. وہ اس منظر کو تکتا رہا.. سکوت کی ٹھنڈک میں سکڑتا رہا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اس منظر کی بے یقینی ایک سرد لہر کی طرح ٹھٹھرتی سرایت کرتی رہی اور وہ منہ کھولے اسے دیکھتا رہا..

سیاہ جال میں اترا ہوا سورج اسی حجاب میں پوشیدہ کوہ سلیمان میں اتر گیا اور پھر نہ پری رہی.. رہی تو بے خبری رہی..

ماماں جعفر اس سے بے خبر کشتی کے کنارے پر دوڑتا.. بانس کو پانیوں میں اتارتا اس شام میں اترتا تھا..

کشتی کی روانی میں رکاوٹ کے آثار دھچکوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگے۔

کنارے کی قربت سے اس کا نچلا دھڑ تہہ کی ریت میں دھنستا تھا..

دونوں پاؤں جب آگے پیچھے حرکت کرتے.. ایک مرتبہ پھر کشتی کے پچھلے حصے تک گئے تو پھر اطمینان میں چلتے ہوئے واپس آئے اور عرشے پر ساکت ہو گئے۔ جعفر نے بانس کو پانی میں سے نکالا اور خاموش کھڑا ہو گیا.. کشتی خود بخود کنارے سے لگنے لگی.. اس نے بالآخر ایک ہوکا سا بھرا اور رک گئی..

تمام نبضیں پانی کی.. روانی اور بہاؤ کی تھم گئیں..

"ادھر پڑاؤ کریں گے سائیں.." جعفر نے فیصلہ کن انداز میں اسے اطلاع دے دی.. وہ آلتی پالتی مارے بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا اس لیے جب اٹھا تو اس کے گھٹنوں میں درد کی ایک سرسراہٹ سی ہوئی.. کمر پر ایک بوجھ سا بھاری ہوا.. اور وہ ایک ہاتھ دائیں گھٹنے پر

جما کر اور دوسرے سے اپنی بوجھل کمر کو سہار کر اٹھا اور جعفر جو کشتی رکتے ہی ایک مینڈک کی طرح اچھل کر کنارے پر جا چکا تھا اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا.. جعفر نے اس کے ہاتھ کو اپنے سکڑے ہوئے مینڈک پنجے میں جکڑا اور وہ گرتا پڑتا کنارے کی ریت پر آ گرا..

"سامان اتاریں گے سائیں.." جعفر نے پوچھا..

کوہ سلمان کا بالی جزیرہ نیم تاریکی میں غرق ہو چکا تھا.. سمندر میں پھر سے روپوش ہو چکا تھا اور اب وہاں ایک سپاٹ اور چند لمحوں میں مکمل تاریکی میں اتر جانے والا ایک سپاٹ اور بے روح افق تھا۔ خاور کے سامنے ایک وسیع ریتلا علاقہ اگرچہ سندھ کی مختلف شاخوں میں گھرا ہوا تھا لیکن ایک بے آباد صحرا کی طرح حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے پار پانیوں کی کوئی لکیر نظر نہ آتی تھی.. دریا کے کوئی آثار نہ تھے.. ریت میں کہیں کہیں جھاڑیاں اور بے نام سے بوٹے تھے اور ان درختوں کی سوکھی ہوئی ٹہنیاں اور تنے ابھرتے تھے جو پانی میں بہتے ہوئے آئے اور کناروں کے ساتھ لگ کر پانی کے اترنے سے دریا سے دور صحرا میں کھو گئے..

وہ کشتی سے منہ موڑ کر شام کے اس بے انت صحرا میں چلنے لگا جس میں ایک عجیب سی کشش اور انجانے بلاوے تھے..

اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس کی کشتی کس مقام پر آ کر رکی ہے.. وہ ریت میں سے پاؤں اکھاڑ تا اپنی کمر پر ہاتھ رکھے۔ گھٹنوں کے درد کی یکدم واپسی کے لیے تیار.. آہستہ آہستہ چلتا گیا.. اور جب اس نے آخر کار مڑ کر دیکھا تو کشتی کسی ریتلے ابھار کے پیچھے روپوش ہو چکی تھی۔

یہ فرار ہی اس کے روگ کا علاج تھا..

یہی اس کے اندر کی تمنا تھی..

کم از کم اس ریتلی تنہائی میں اس ایک اور شام میں.. بل ڈوزر کی مہیب گڑگڑاہٹ داخل نہیں ہو سکتی تھی.. اس کے ایک عفریت کی مانند منہ کھولے بلیڈ اس کے کتب خانے کو' مسودوں اور نایاب تصاویر کو.. اس کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو.. اس کے ٹوتھ برش اور آفٹر شیو لوشن کو.. ہیئر کلر کی ٹیوب اور ریزر کو.. نگل نہیں سکتے تھے.. اس کی حیاتی کو مسمار نہیں کر سکتے تھے.. وہ یہاں محفوظ تھا.. ایک ایسے گھر میں تھا جسے کوئی نہیں گرا سکتا تھا۔

یہاں وہ غلافی آنکھوں کی کوٹھڑی کی قید میں بھی نہ تھا..

اسے عابدہ سومرو کے بدن کے نیلے دھبے اور کھرینڈ بھی نہیں ستاتے تھے..

بس وہ تھا.. اور قدموں تلے کھسکتی ریت اور چپ تھی.. ایک اور شام تھی اور ریتلے ابھار کے عقب میں کسی کشتی کا وجود نہ تھا..

ٹنن ٹنن ٹنن..

جو خاموشی تھی اس میں سے گھنٹیوں کی آوازیں تیرتی.. انکتی.. اس کے کانوں تک آئیں۔ وہ رک گیا۔

جو نبضیں تھم چکی تھیں.. ان کی مردہ خاموشی میں سندھ کے جو پانی نظر نہیں آتے تھے ان پر سفر کرتیں وہ آوازیں آنے لگیں..

گھنٹیوں کا ایک مترنم آرکسٹرا تھا جو ریت کے ہر ذرّے میں کھنکنے لگا..

ٹن.. ٹنن.. ٹنن..

ہر گھنٹی کی ٹنن سے ایک مندر ناپو کی ریت پر ابھرتا تھا..

یہ آوازیں اتنی بلند تھیں کہ افق میں روپوش ہو چکے کوہ سلیمان کے کنگروں پر دستک دیتی تھیں اور اتنی مدھم اور سریلی بھی تھیں کہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور اتنی پر تاثیر تھیں کہ سندھ کے پانیوں کی گہرائی میں جتنی مچھلیاں تھیں ان کے گلپھڑوں پر اثر کرتی تھیں اور ہر اس اندھی ڈولفن کو جو پانیوں کے اندر تھی یا ان کے باہر سانس لینے کو آتی تھی اسے اپنے ترنم سے بینائی دیتی تھیں۔

یہی کل کائنات تھی..

جس کائنات میں وہ تھا۔ ریت کے وسیع علاقے میں.. ایک دشت کے پھیلاؤ میں.. جہاں سبز گھاس کے چھدرے تنکے کہیں کہیں نمودار ہو کر سر اٹھاتے تھے.. اس کے قدم ریت میں دھنستے تو کتنے تنکے اس کے جاگرز تلے آکر ریت میں دب جاتے..

اس کل کائنات میں گھنٹیوں کی سریلی صدائیں گونج رہی تھیں۔

سب کے سب مندر ویران پڑے تھے اور ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور صرف وہ ایک پجاری تھا جو انہیں سن رہا تھا۔

سریلی صداؤں کی گونج آنکھوں سے اوجھل پانیوں پر سے گزرتے ہوئے دوچند ہوتی.. ریت کے بے انت پھیلاؤ پر پھیلتی اور اسے مسخر کرتی تھی..

یہ حواس کو مکمل طور پر کھو دینے کی دلیل تھی.. ورنہ غازی گھاٹ سے طویل آبی مسافتوں پر.. سندھ کے کسی بے نام جزیرے کی شام میں.. وہ کونسا موتزارٹ تھا جو پیانو بجا رہا تھا۔ کون بیتھوون تھا جو مون لائٹ سناٹا کی دھن چھیڑ رہا تھا اور کیسا خورشید انور تھا جو "گھونگھٹ" کی آسیب زدہ گھنٹیاں کمپوز کرتا تھا.. کوئی نہ جانے کب آئے.. جنم جنم کی پیاس بجھائے.. کوئی آئے..

جعفر اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا.. اور وہ بے خبر رہا تھا.. اس کے سیاہ پاؤں ریت میں دھنستے نہ تھے وہ ایسے چلتا آتا تھا جیسے اس کے قدموں تلے ایک فرشِ مخمل ہو۔

نم آلود شام کی ہوا میں اس نے اس کے قریب پہنچ کر ایک گہرا سانس لیا۔

"سائیں سندھ کے کناروں پر.. شام ڈھلتی ہے تو مویشی پانی پینے کے لیے اترتے ہیں۔ تو ان کے گلے میں بندھی گھنٹیاں پانیوں پر تیرتی ہیں۔ دور تک جاتی ہیں آپ سُنتے ہو سائیں۔"

"ہاں جعفر.. میں سنتا ہوں۔"

"شام ہوتی ہے ناں سائیں.. تو ادھر جو دھن وال ہیں ان کے کچے ڈیروں میں سے مویشی چلتے ہیں اور دریا کے کناروں تک آتے ہیں تو یہ ان کا بلاوا ہے.. سُنتے ہو سائیں؟"

"ہاں.."

"یہاں سے تو کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ مویشی دور ہیں اور اوجھل ہیں.. پر گھنٹیوں کا بلاوا... پانی پر چلتا آتا ہے تو نزدیک لگتے ہیں پر بہت دور ہیں..."

وہ کان لگائے دھیان لگائے سنتا رہا.. سندھ کے مندر میں لگاتار گھنٹیاں بجتی تھیں .. ان میں کلیسائیوں کی گھڑیال گونج نہ تھی بلکہ ایک آہستہ اور نسوانی ترنم تھا.. پھر ان کے مدھرپن اور آوازوں کی مدت میں وقفہ آنے لگا.. ترنم اب اٹک رہا تھا.. رک رک کر آتا تھا.. وقفے کی مدت طویل ہونے لگی اور بہت دیر بعد کسی ایک گھنٹی کی آواز آجاتی جیسے اسے خاموش رہتے ہوئے یکدم خیال آگیا ہو کہ اس نے دریا پار کسی منتظر کان کو ایک آخری سندیسہ بھیجنا ہے.. گھنٹیوں کی اس سمفنی بجانے والے سازندوں نے اپنے ساز رکھ دیئے تھے .. سندھ کی نبض پھر سے تھم گئی.. سناٹے کو واپس آنے میں کچھ دیر لگی اور جب وہ اس کے آس پاس پھر سے اتر گیا تو بہاؤ کی مدھم لے سنائی دینے لگی..

"مویشی پانی پی کر اپنے باڑے کو لوٹ گئے ہیں سائیں.. رات ادھر کریں گے ناں سائیں؟"

اس ٹاپو کے پار جس کے پیچھے وہ روپوش ہو گئی تھی وہ گئے تو کشتی ایک کھلونے کی طرح ریت میں رکی ہوئی نظر آنے لگی.. جیسے کوئی جہاز مدوجذر کے زور سے خشکی پر آگیا ہو اور پانی سمٹ کر واپس چلے گئے ہوں.. ایسے وہ ایک طویل فاصلے سے.. یہاں سے دکھائی دی.. اوڈیسیس کی کشتی کے روپ میں.. سنہری کھال کی تلاش میں سرگرداں سحر طراز سمندروں میں نہیں.. لیکن خاور 'اوڈیسیس' کی مانند بامقصد اور پختہ ارادہ رکھنے والا شخص نہیں تھا.. وہ کسی سنہری کھال کی تلاش میں نہیں تھا.. یہ ایک بے وجہ بے جواز اور بے مقصد سفر تھا..

"پھر سائیں آپ حکم کرو.."

"ٹھیک ہے رات ادھر کریں گے.. تم جا کر سامان نکالو.. میں آجاؤں گا.."

جعفر کے چہرے پر اطمینان آگیا" جا کر نکالتا ہوں سائیں.. سرور کو بولتا ہوں کہ آپ کا تنبو لگائے.. اور فہیم کو کہتا ہوں کہ کھانے کی دیگچی چڑھائے.. آپ آرام سے آجانا" وہ پلٹا اور ریت کو روندتا اس پر ایک سنگ مرمر کے فرش کی طرح چلتا کشتی کی جانب چلنے لگا۔

ریتلی کائنات مکمل سناٹے میں چلی گئی جس میں صرف اس کا سانس چلتا تھا.. یہ تنہائی اتنی بڑی تھی کہ وہ اسے سنبھال نہیں سکتا تھا۔

بل ڈوزر کے بلیڈ نے صرف اس کتابوں اور ٹوتھ برش اور لیمپ کو ہی نہیں اس کی زندگی کو بھی اور اسے بھی مسمار کر دیا تھا..

دور ریت کی ایک طویل مسافت کے پار کھلونا دکھائی دیتی بڑی تنہائی میں چھوٹی سی کشتی میں سے سرور اور جعفر اس کا سامان نکال کر کنارے کی ریت پر ڈھیر کر رہے تھے.. اور وہ اتنی دور تھے کہ مکوڑے سے لگتے تھے جو رینگ رہے تھے.. کشتی کے کھلونے میں سے دو بونے نکلتے تھے اور کنارے پر جھک کر واپس چلے جاتے تھے..

ابھی کچھ روشنی تھی۔

وہ بہت دور.. بُت بنا بغیر کسی احساس کے.. مقصد کے.. وہاں اس سناٹے کی کوکھ میں کھڑا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ وہ دو بونے اب کشتی کے اندر واپس نہیں جاتے.. مکوڑے اس کے آس پاس رینگ رہے ہیں تو وہ ان کی جانب چلنے کو تھا کہ اس کے کانوں میں نامانوس سی آوازیں ایک تواتر کے ساتھ آسمان سے اترنے لگیں.. بہاؤ کی ہلکی سرسراہٹ اور ہوا کی نامعلوم مسافت پر حاوی ہوتی.. جیسے کہیں بہت سارے کوّے بولتے ہوں.. اس نے سر اٹھا کر نظروں

سے بڑی تنہائی والے بڑے آسمان کی خالی وسعت کو کھنگالا یہ تعین کرنے کے لئے کہ یہ آوازیں کدھر سے اتر رہی ہیں.. ان کا منبہ کہاں ہے.. جنوب کی جانب.. ابھی کچھ روشنی تھی اگرچہ شام کا غلبہ مکمل ہونے کو تھا.. جنوب کے آسمان پر اس کے خالی پن اور سپاٹ وجود میں ایک سیاہی سی تیرتی تھی.. جو لحہ بہ لحہ بلندی کو کم کرتی نیچے آتی تھی اور جب اس کے نقش واضح ہوتے تو سیاہی کی وہ لکیر ٹوٹنے لگی اور چھوٹے چھوٹے سیاہ دھاگوں میں بٹنے لگی.. پھر ان دھاگوں کو پر لگے اور وہ الگ الگ اڑتے دکھائی دینے لگے.. پرندوں کی ایک ڈار تھی..

نیچے اترتی.. تیزی سے بلندی کم کرتی.. کوؤں کی آوازوں میں غل کرتی.. ریتلے ناپو کی جانب چونچیں نیچے کئے..

اور صرف وہی ایک ڈار نہ تھی۔

اس کے کچھ فاصلے پر.. اس کے پیچھے پیچھے پرواز کرتا پروں کا ایک اور ہجوم تھا.. ایک اور ڈار تھی.. اس کے دائیں اور بائیں جانب سے بھی ہزاروں پرندے اس کی پیروی کرتے چلے آتے تھے اور کوؤں کی طرح شور مچاتے آتے تھے.. وہ بے انت اور بے حساب تھے.. جو راہنما ڈار تھی وہ نہایت منظم ترتیب سے ایک ہراول دستے کے طور پر انہیں راستہ دکھا رہی تھی اور سب سے بلند آہنگ اُسی کی کائیں کائیں تھی..

پہلی ڈار بہت نیچے آ گئی.. اتنی قریب کہ وہ اس میں شامل ایک ایک پرندے کی آنکھ دیکھ سکتا تھا.. اس کے پر شمار کر سکتا تھا.. وہ اتنی قریب آ چکی تھی.. لیکن یکدم ہر پرندہ ٹھٹکا.. انہوں نے اس کے سر کے عین اوپر آ کر اپنی پرواز کا چکر مکمل کیا اور پھر رخ بدل کر شور مچاتے پلٹ گئے اور جس لمحے وہ یکدم پلٹے تو پہلے وہ شام میں نیم سیاہ دکھائی دیتے تھے اور اب پلٹنے سے رخ بدلنے سے وہ غروب کی چند کرنوں کی زد میں آ گئے اور ان میں سے ہر پرندے کا وجود سنہری ہو گیا.. ایک ایک پر سونے میں ڈھل گیا..

ان کے عقب میں آنے والی ڈار نے جب انہیں ارادہ بدل کر پلٹتے دیکھا تو وہ بھی اپنے پروں کو ترچھا کرنے لگی اور ان پر بھی سونا نچھاور ہونے لگا..

وہ دم بخود کھڑا رہا.. گردن اوپر دیکھتے دیکھتے دکھنے لگی.. آج تک اس نے اتنے پرندے اتنی بڑی تعداد میں قدرت کے اس نظام میں جو صرف ان کے لئے تخلیق کیا گیا تھا اڑتے ہوئے نہیں دیکھے تھے..

"سائیں سامان اتر گیا ہے.. فہیم مرغی بھونتا ہے.." جعفر اس کی آسمان پر جمی نظروں کے دامن میں چلتا ہوا اس کے پاس آ چکا تھا اس لئے وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔

"جعفر نے بھی اس کی نظروں کی پیروی کرتے ہوئے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور وہی دیکھا جو وہ دیکھ رہا تھا اور کہنے لگا.. "سائیں منگھ دیکھتے ہو؟"

اس نے سر نیچے کیا تو اس کی گردن دُکھی.. اور اسے جعفر سامنے کھڑا نظر آیا "منگھ؟"

"یہی جو پنکھ پکھیرو دیکھتے ہو یہ منگھ ہیں.. یہ ہمارے سندھ سائیں کی پناہ میں آتے ہیں چار دیہاڑے پالے کے دن کاٹنے.. یہاں سے بہت آگے جاتے ہیں اور پھر ان دنوں اپنے دیسوں کو لوٹنے کے لیے واپسی کا سفر کرتے ہیں.. ادھر اس علاقے میں اس ٹاپو پر رات کر کے آگے جاتے ہیں۔ یہ ان کی چراگاہ ہے سائیں۔ یہ گھاس کے تنکے نہیں دیکھتے.. ان کو چگتے ہیں اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اگلی سویر کوچ کر جاتے ہیں اپنے وطنوں کو.."

"انہیں آپ منگھ بولتے ہو؟"

"جی سائیں.. لیکن جو شہر والے ادھر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ہنس ہیں۔"

"ہنس؟"

"ہاں سائیں.."

"یہ کوؤں کی طرح شور مچا رہے ہیں.."

"ہاں سائیں شور تو کریں گے ناں غریب پردیسی.. آپ اپنے گھر میں کسی غیر کو دیکھو گے تو شور تو مچاؤ گے ناں.. اچھا تو نہیں لگے گا آپ کو.. ان کو عادت نہیں ہے ناں کہ سارا دن اڑنے کے بعد رات کرنے کو اپنی چراگاہ کے اوپر آئیں تو اس ویران ٹاپو پر کوئی غیر بندہ بشر کھڑا ہو.. آپ غیر ہو ناں سائیں تو یہ غریب شور مچاتے ہیں بے چارے پردیسی کہ یہ کون ہے اور ہمارے ٹاپو پر کیوں آیا ہے.."

"تو یہ اب یہاں نہیں اتریں گے؟"

"نہ سائیں.."

"تو کدھر جائیں گے؟"

"ان کو شور کرنے دو سائیں.. یہ ابھی تھک ہار کر کہیں اور جا کر رات کر لیں گے.. ادھر اور بھی جگہیں ہیں.. میں نے سامان نکال لیا ہے.." جعفر ابھی تک پلٹتے اور پھر

واپس آتے ہنسوں کے شور مچاتے ہجوم سے غافل ہو گیا۔ "فہیم نے چولہا گرم کر دیا ہے اور ماماں جعفر کہتا ہے کہ آج کی رات میں اپنے صاحب کو اپنی عاشقی معشوقی کے قصے سناؤں گا.. ماماں جعفر عورتوں کے معاملے میں بڑا کاریگر آدمی ہے سائیں.."

ہنسوں کی ڈاریں اس کے عین اوپر گردش میں تھیں۔ بلبلاتی فریاد کرتی اور اس پر لعنت بھیجتی ذرا نیچے اترتی تھیں اور پھر اوپر ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنی چراگاہ کے تقدس کو پامال کرنے والے پر نفرین بھیجتی تھیں.. باری باری نیچے آتی تھیں اور کائیں کائیں کا احتجاج بلند کرتی پلٹ کر پھر سے بلند ہو جاتی تھیں..

ہزاروں ہنس تھے.. غل کرتے.. ابھی تک اُسی بلندی پر جہاں ان کے پروں پر غروب کی آخری کرنیں پڑتی تھیں اور نیچے ٹاپو پر نیم تاریکی تھی۔

"تو اب یہ نیچے نہیں اتریں گے؟"

"کون سائیں؟" جعفر ان کے وجود کو اور شور کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

"یہی.. منگھ!"

"نہ سائیں.. یہ گھبرا گئے ہیں.. ابھی کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں چلے جائیں گے۔"

خاور ابھی تک سیدھا کھڑا انہیں تک رہا تھا... اس نے سر جھکایا اور پلٹ کر کشتی کی طرف چلنے لگا۔ شرمندہ اور خجل..

"جعفر.."

"جی سائیں.."

"یار تمہیں تھوڑی تکلیف تو ہو گی.. پر آج رات کسی اور ٹاپو پر جا کرتے ہیں.. دوسرے کے گھر میں رات کرنا اچھا نہیں لگتا.."

"پر سائیں.. سامان نکال لیا ہے.. تنبو لگ گیا ہے اور فہیم چولہا جلاتا ہے۔ منگھ کا کیا ہے.. سندھ میں ڈوبیں گے تو نہیں.. کہیں نہ کہیں جا بسیرا کریں گے".. جعفر تھوڑا سا طیش میں تھا لیکن سنبھل کر.. اگرچہ ناگواری چھپا نہیں سکتا تھا.. سنبھل کر کہہ رہا تھا..

"مہربانی ہو گی تمہاری.. کہیں اور چلتے ہیں۔"

اور جب وہ دونوں کشتی تک پہنچے تو وہاں ایک عارضی بستی کو بسانے کے بندوبست ہو چکے تھے.. اس کا خیمہ ریت میں نیچے گاڑے نصب ہو چکا تھا.. فہیم دیگچی میں جھانکتا تھا..

سرور سامان کے اوپر ایک ترپال پھیلا رہا تھا اور پکھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور تاریکی میں جا رہی تھی..

وہ وسیع ناپو اور چراگاہ جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اب اس کے غیر وجود سے خالی ہو کر اپنی آبائی ویرانی کو لوٹ گئی تھی.. ایک مختصر سا وقفہ آیا.. بہاؤ کی سرگوشیوں نے چراگاہ کے گرد گردش کی اور پھر وہ اترنے لگے..

ہنسوں کی پہلی ڈار اس کے ایستادہ خیمے اور کشتی سے بہت پرے اس مقام پر جہاں وہ ابھی تھا وہاں اپنی چراگاہ کی ویرانی میں اطمینان سے اترنے لگی.. پروں کا ایک تاریک ہجوم تھا جو آسمان سے نیچے ہو کر ریت پر اترتا تھا.. ایک ایک ہنس الگ الگ اترتا تھا کیونکہ ہر ہنس جب ریت کی قربت میں آتا تھا تو اس پر اترتے ہوئے اس کے پروں اور پنجوں کا انداز مختلف ہوتا تھا۔

ان میں سے کوئی ایک ہنس ایسا تھا جس کی آنکھیں غلافی تھیں.. اور آنسوؤں سے لبریز تھیں.. کوئی ایک ہنس ایسا تھا جو قربت مرگ میں اپنا آخری گیت گاتا ہے.. اس کے بدن پر نیلے دھبے اور کھرینڈ تھے اور وہ سات آئینوں میں الگ الگ دکھائی دیتا تھا۔

اور سلطانہ کی نیلی خانہ بدوش آنکھوں والا ہنس بھی شائد انہی میں سے ایک تھا جو ابھی چراگاہ میں اترنے کو تھا۔

بجھے دل سے سرور اور جعفر کنارے پر ڈھیر سامان کو اپنے اوپر بوجھ کر کے واپس کشتی میں لے جا رہے تھے.. فہیم چولہے پر رکھی گرم دیگچی کو ایک دستر خوان میں لپیٹ کر نہایت ناراضگی سے اٹھا رہا تھا..

خیمہ سب سے آخر میں اکھاڑا گیا.. اور تاریکی بڑھ رہی تھی.. وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ یہ مختص چند پرندوں کی آہ وزاری کے باعث اس ناپو کو کیوں چھوڑتا ہے.. بستی جو مشکل سے آباد ہوئی تھی اسے اجاڑ دینے کو کیوں کہتا ہے.. پرندے تو شور کرتے رہتے ہیں اور کہیں اور کیوں جاتا ہے رات ہونے والی ہے پانیوں میں بھٹکنے کے لیے کیوں جاتا ہے..

بانس اٹھاتے ہوئے جعفر نے اگرچہ سرور سے کہا لیکن دراصل خاور سے مخاطب ہوا "سرور ہوئے.. لالٹین جلالو.. ابھی تو رات کرنے کے لیے کیا معلوم کدھر جانا ہے.."

"موت مجھے تمہارے پاس لے آئی ہے.. ڈیتھ!"

نیلی خانہ بدوش آنکھیں مرگلہ پہاڑیوں کے اندر اُن میں 'پرائی آنکھوں سے پوشیدہ ندی کے بہاؤ کو ایک ایسی سکرین کی طرح دیکھتی تھیں سحر زدہ دیکھتی تھیں جیسے ان پانیوں پر وہ سب عبارتیں رقم ہیں.. وہ خود سے کچھ نہیں کہتی تھی صرف اُن پر لکھی گئی عبارتوں کو ایک سپاٹ لہجے میں پڑھتی جاتی تھی جیسے ایک بچہ تختی پر لکھی گئی عبارت دوہراتا چلا جاتا ہے اور وہ سورج کی مدھم حدت سے عاری سرمائی کرنوں سے لشکتی پانی کی سطح پر نظریں جمائے انہیں ایک ذہین بچے کی طرح بلا اٹکے پڑھتی جاتی تھی اور یہ عبارتیں ٹھہرتی نہ تھیں' بہاؤ کے ہمراہ بہہ جاتی تھیں اور ان کی جگہ نئی عبارتیں اس آبی تختی پر ظہور میں آجاتی تھیں..

بہاؤ کی روانی میں کمی آتی تھی تو وہ بھی مدھم ہو جاتی تھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتی تھی اور جب پانیوں کا کوئی ریلا تیزی سے آتا تھا تو وہ بھی اس کی رفتار کے حساب سے تیز تیز بولنے لگتی تھی.. اسے وہ سب کچھ کہنا تھا جو پانیوں پر درج تھا اور بہتا جاتا تھا.. وہ کوئی ایک سطر ایک لفظ خطا نہیں کرنا چاہتی تھی.. ان عبارتوں کے بہہ جانے سے پیشتر انہیں خاور تک پہنچا دینا چاہتی تھی کیونکہ کوئی ایک لفظ یا ایک سطر بھی اگر زندگی کے تانے بانے کی بُنت میں سے رہ جائے تو وہ ادھوری رہ جاتی ہے۔ اگر ایک لفظ بھی پانیوں کے ساتھ بہہ جائے تو وہ واپس نہیں آتا اور اس کی کمی سے بُنت میں سوراخ رہ جاتا ہے..

مشرقی لبادے میں جو مکمل امریکی لہجہ تھا اس میں کہیں بناوٹ نہ تھی.. وہ آبائی تھا..

"تمہاری سب تحریروں میں موت حکمران ہے۔ اسی فیکٹر نے مجھے فیسی نیٹ کیا